OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

Al-Qamar, Volume 4, Issue 2 (April-June 2021)

# اردو ادب میں مذہبی رجحانات: بیسویں صدی کی منتخب خواتین افسانہ نگاروں کا مطالعہ

# (Religious Trends in Urdu Literature: A Study of Selected Women Fiction Writers of the Twentieth Century)

**Shazia Andleeb**

*Doctoral Candidate, Department of Urdu, GC Women University, Faisalabad*

**Dr. Sadaf Naqvi**

*In charge, Department of Urdu, GC Women University, Faisalabad*

## Abstract

This article discusses the religious trends of selected twentieth century women Urdu fiction writers. Focusing on *Akhtar Jamāl, Jīlānī Bāno, Qurratulain Hayder, Hājra Masroor, Khadīja Mastoor, Bāno Qudsia, Khālida Hussain, Jamīla Hāshmī, Sāira Hāshmī*, it explores that firm belief in Allah Almighty, respect for humanity, moral values and deference for women are prominent subjects in these women's fictions. They have deep spiritual experiences of realities of life and Universe. Not only spiritual and esoteric observations, but conditions associated with them are skillfully described in their fictions. These writers have developed Islamic propensity in the genre of Urdu fiction, by writing comprehensively on a number of themes related to Islamic ideology.

**Key Words**: Religion, Urdu, fiction, women

## تمہید

ادب میں اسلامی نظریات و عقائد بلاشبہ شروع سے شامل تھے، لیکن اس کے لیے باقاعدہ تحریک قیام پاکستان کے بعد وجود پذیر ہوئی، اس کی بنیادی وجہ دین سے تعلق استوار رکھنا اور بے راہ روی سے بچنا تھا۔ جب ترقی پسند تحریک کے نتیجے میں ادب میں مادی نظریات کو غیر معلمولی اہمیت حاصل ہوئی؛ مولوی ازم کے نام پر اسلامی ضابطۂ حیات سے انحراف در آیا؛ غیر اسلامی مغربی

CC BY

نظریات فروغ پانے لگے، تو اس کے رد عمل میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی نظریۂ حیات کی ترویج کی غرض سے اسلامی ادب کی تحریک منظم صورت میں سامنے آئی؛ اس تحریک کا باقاعدہ ایک منشور تھا، جس پر اِس تحریک کے حامیوں نے دستخط کیے تھے۔ اِس تحریک سے وابستہ رسائل بھی جاری کیے گئے؛ ملک کے مختلف حصوں میں اس کی شاخیں قائم کی گئیں اور مجالس کا اہتمام بھی کیا جانے لگا۔ ترقی پسند تحریک پر 1952ء میں پابندی لگنے سے اس تحریک کی سرگرمیوں میں وسعت پیدا ہوئی۔ تحریک ادبِ اسلامی نے مولانا مودودی کے افکار کا اثر بھی قبول کیا، جنھوں نے ادب کو بھی تبلیغ کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ اُن کے نزدیک ادب حسن کلام اور تاثیر کلام تھا۔ مولانا کے ساتھ دوسرے علما بھی اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ ان حضرات کے نزدیک اسلامی ادب تبلیغی ہے، اس کا ایک اعلیٰ حصہ اور وسیع افادہ ہے، اور وہ اس سے کم کوئی چیز نہیں کہ انسان کی زندگی اپنی علم تہوں کے ساتھ نکھر جائے، یہاں تک کہ اس کی حدیں زوال و فنا کی سرحدوں سے آگے بڑھ جائیں اور اس کا عروج سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ سکے۔[1]

مضبوط نظریاتی اساس کے باوجود اس تحریک کا دائرہ اثر محدود رہا اور تخلیقی سطح پر کوئی بڑا کارنامہ سامنے نہ آسکا، کچھ ہی عرصے بعد یہ تحریک خود بخود ختم ہوگئی، لیکن اسلامی ادب، ادب کا حصہ رہا۔ اس صنف کے اُردو افسانے کے تخلیقی حوالوں سے فقدان کی وجہ تخلیق کاروں کی عدم دستیابی بھی تھی؛ نظریاتی اساس مضبوط ہونے کے بعد اس کو اعلیٰ تخلیق کار میسر نہ آسکے۔ نعیم صدیقی، فروغ احمد، ابن فرید، نجم الاسلام اور خورشید احمد اس کے رفقا تھے، اور اس کے ماتحت ادب میں خطابت کا لہجہ نمایاں تھا۔ افسانہ نگاری جس خونِ جگر کی متقاضی تھی، وہ اس تحریک کے ادبا میں نظر نہ آئی۔ ماہر القادری اور نعیم صدیقی جیسے لوگ اس تحریک کے حوالے سے نمایاں رہے۔ ڈاکٹر انوار سدید کے بقول: "تحریک اسلامی کے افسانہ نگاروں نے اسلامی قدروں کے امتیازی نقوش نمایاں کرنے کے بہ نسبت صداقت کی قدروں کو نمایاں کیا۔ اس تحریک نے اُردو افسانے میں کوئی قابل قدر افسانہ نہیں کیا۔"[2]

دوسری طرف لکھنے والوں میں حسن عسکری، منٹو، انتظار حسین نمایاں تھے۔ خواتین میں ممتاز شیریں نمایاں ہیں۔ ممتاز شیریں نے تقسیم کے بعد افسانہ نگاری ترک کر دی تھی۔ دوسرے افسانہ نگار اپنے طے شدہ راستوں پر چلتے رہے۔ حسن عسکری کے مطابق: "انھوں نے چند ایسے افسانے بھی سوچے تھے، جن میں یہ دکھایا گیا تھا کہ ہماری عوام میں اپنی مدد آپ کرنے کی صلاحیت اور تخلیقی اہلیت کتنی زبردست ہے، مگر اتفاق سے انھی دنوں منٹو صاحب اپنی فلم میں مصروف ہوگئے، اور وہ افسانے لکھے نہ جاسکے۔"[3] اُسی دور میں 1947ء سے قبل عصمت چغتائی بھی لکھ رہی تھیں۔ معمولی ردوبدل کے ساتھ وہ بھی اپنی روش پر قائم رہیں۔

اسلامی پاکستانی ادب کی تحریکیں بنیادی طور پر رد عمل کی تحریکیں تھیں اور اس رد عمل میں بہت سی باتیں پیچھے رہ گئیں، جو تحریکوں کی ابدیت کا باعث ہوتی ہیں۔ اسلامی تحریک کا آغاز ایسے وقت میں ہوا تھا، جب ادبی سنجیدگی مد نظر نہ تھی۔ پوری قوم

---

[1] ڈاکٹر عبد المغنی، "اسلامی ادب اور اس کے مسائل" مشمولہ، ادب کی تعمیری حیثیت، مرتبہ۔ انجم نعیم (ملتان: فرینڈز پبلی کیشنز، س ن)، 86۔

[2] ڈاکٹر انور سدید، اُردو ادب کی تحریکیں، (کراچی: انجمن ترقی اُردو، اشاعت دہم، فروری 2018ء)، 556۔

[3] محمد حسن عسکری، پاکستانی ادب، ساقی، (کراچی: جولائی، اگست، ۱۹۴۹ء)، 62۔

ایک المیے سے دوچار تھی۔ نیا ملک اور اس کے مسائل 1947ء کے بعد سامنے تھے۔ کسی نئی ادبی جدوجہد کے لیے فضا ہموار نہ تھی۔ پہلے سے لکھنے والوں اور نئے لکھنے والوں کے سامنے فوری مسائل تھے۔ ہجرت تھی، بے سروسامانی تھی۔ اُردو افسانے پر اس تحریک کا براہ راست کوئی ردعمل نظر نہیں آتا، تاہم بالواسطہ طور پر اس کے آثار موجود تھے۔ یہ آثار اُردو افسانے میں پاکستانی ماحول، پاکستانی معاشرے کے جذبات واحساسات اور فکری، ذہنی رویوں کی صورت میں موجود رہے۔ ساٹھ کی دہائی میں جب اُردو افسانے میں جدیدیت نمایاں ہوئی تو یہ تحریک اپنے معنوی عناصر کے ساتھ زندہ ہوگئی۔ اس زمانے میں عجمی، عربی اسکالروں اور تمثیلوں کا استعمال، مذہبی حوالے، تصوف، مابعد الطبیعاتی عناصر، اساطیری انداز، لوک دانش، کرداروں کی اپنی تہذیبی اور ثقافتی بنیادوں کی تلاش، اسی تحریک کا تسلسل ہیں۔ اسلامی پاکستانی ادب کا جو تشخص ان تحریکوں کے پیش نظر تھا، ایک واضح شکل اختیار کر گیا۔ اس تناظر میں زیرِ نظر سطور میں بیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں میں مذہبی رجحانات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ہمارا فوکس منتخب خواتین افسانہ نگاروں کے مذہبی رجحانات پر رہا ہے۔

## اختر جمال

اختر جمال (1930ء-2011ء) [4] کے یہاں محبت انسانی ہمدردی، نیکی کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔ "سمجھوتہ ایکسپریس" میں شامل افسانے "اصیل مرغ" میں کردار "شمو" خالو سونا گاؤں کے جاگیر دار تھے، اور گاؤں کے لیے ایک سایہ دار درخت کی مانند تھے۔ دلی افسانے میں فسادات کی عکاسی اختر جمال اس طرح کرتی ہیں کہ اپنے وقت میں انھوں نے لوگوں کا اس طرح خیال رکھا کہ مشکل حالات میں لوگ ان کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ خالو میاں کو جو خون نظر آرہا تھا، وہ سب طرف بہتا دکھائی دینے لگا، خالو میاں کا اپنا آشیانہ بھی اس کی نظر ہو گیا، گاؤں کے کسانوں نے اپنے گھروں میں خالو میاں، خالہ جی اور بچوں کو کئی دن پناہ دی۔ [5] افسانے کا اختتام اس طرح ہوتا ہے کہ خالو میاں کا جنازہ جارہا تھا، ہر رنگ اور نسل کے لوگ ہر مذہب اور ملت کے لوگ شامل تھے۔ [6]

خالو میاں کا کردار ایسے لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے، جنھوں نے اسلامی اصولوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا۔ دولت مند ہونے کے بعد انسانی ہمدردی، رواداری اور سب سے بڑھ کر خوف خدا دل میں رکھنے کی وجہ سے اُسے بھی لوگوں کا پیار اور ہمدردی ملی اور آخری وقت تک ہر مذہب کے لوگ ان کے جنازے تک کے ساتھ تھے۔

تصوف کی اصطلاح میں جدائی سے مراد خدا سے جدائی ہے، یہی جدائی اضافی حیثیت میں انسان کی انسان سے جدائی کی شکل میں بھی نظر آتی ہے۔ صوفی ہمیشہ خدا سے ملنے کا تمنائی رہتا ہے اور فرد کی فرد سے جدائی بھی تکلیف کا باعث ہے۔ اختر جمال کے افسانے "سمجھوتہ ایکسپریس" میں شامل "چکن کا کرتا" اسی گہرائی کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اسلامی تصورات میں عورت کو نمایاں مقام

---

[4] اختر جمال بھوپال سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے دادا تفضل حسین ذکا ایک صوفی شاعر تھے۔ ان کی مناجات کی ایک کتاب "مناجات ذکا" کے نام سے شائع ہوئی۔ ان کے والد اور والدہ بھی علم و ادب سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ ان کے افسانوی مجموعوں کے نام "انگلیاں فگار اپنی"، "زرد پتوں کا بن"، "سمجھوتہ ایکسپریس"، "خلائی دور کی محبت"، "چاند ستاروں کا لہو" ہیں۔

[5] خدیجہ مستور، تھکے ہارے (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1995ء)، 260۔

[6] اختر جمال، سمجھوتہ ایکسپریس (لاہور: اکیڈمی، 1989ء)، 94۔

دیا گیا اور تذلیل نسواں کو پسندیدہ نظروں سے نہیں جانا جاتا۔ عورت کو آج بھی وہ مقام نہیں دیا گیا جو اُس کا حق تھا، جو اسے اسلامی نظریۂ حیات میں دیا گیا۔ مسلم عورتوں کی ہر طرح 'اغوا، زیادتی اور تذلیل ہوئی جو کہ بہت افسوس ناک ہے۔ کشور ناہید لکھتی ہیں:" چالیس ہزاروں قتل کر دی گئیں، ہزاروں اغوا ہوئیں، بیویاں بنائی گئیں، ستم ظریفی یہ رہی کہ جو بچھڑ گئیں اور وہ جنھیں اپنے مل بھی گئے، مگر انھوں نے اس داغ کو اپنا کہنے سے گریز کیا۔ اپنا ماننے سے اجتناب کیا، ہیجان لینے سے انکار کیا۔"[7] اختر جمال نے منفی رویوں مذہب اسلام سے دوری اور فتنہ فسادات کو اپنے افسانوی ادب کی روشنی میں بڑی وجوہات ہیں، جن کے سبب مسلمان اپنی اصل سے ہٹ چکے ہیں۔

**بانو قدسیہ**

بانو قدسیہ (1928ء-2017ء)[8] عصر حاضر کے بہت سے مذہبی مسائل جو کہ معاشرے کے اسلامی طرز زندگی سے دوری کی وجہ سے پیدا ہوئے، ان کو موضوع بناتی ہیں۔ جب تک زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل ہے، عہدہ ہے، روپے پیسے کی فراوانی ہے، آپ سب کے لیے اہم ہیں، ان کے ختم ہوتے ہی آپ کی اہمیت ختم ہوئی، جو کہ انسانیت کی اقدار کے خلاف ہے، مذہب کے خلاف ہے، اسلامی تصورات حیات کی نفی ہے، ایک ایسا "شر" ہے، جو معاشرے میں فروغ پا چکا ہے اور افراد کی زندگی کو نفسیاتی طور پر ختم کر رہا ہے اور دین سے دوری اور مادیت پرستی کی جڑ ہے۔ بانو قدسیہ اپنے افسانے "تدبیر لطیف" جو اُن کے افسانوں کے مجموعے "دست بستہ" میں شامل ہے، ایک ایسی شخصیت کو موضوع بناتی ہیں، جو بڑھاپے کی حالت میں محتاجی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، جب کہ وہ معاشی طور پر بھی مستحکم ہے۔ معاشرہ اسلامی اقدار اور روایات سے ہٹ چکا ہے۔ آج سے دس سال پہلے گھر میں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، جلسہ، جلوس، بحث مباحثہ ہر رنگ اور عمر کے سیاسی دوست خیالی پلاؤ، جوشیلی تقریروں کا جوڑ توڑ، اس مصروف زندگی میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کبھی وہ اس قدر خاموشی کے سپرد ہو جائے گا۔ بچے باہر کے ممالک میں قیام پذیر زمینی فاصلے سے دوچار ہوں گے۔[9] وہ اپنی بیوی کی بیوگی سے بھی پریشان ہے۔ اُسے طلاق دے کر اس کے لیے مضبوط سہارا تلاش کرتا ہے تاکہ اس کے جانے کے بعد وہ تنہا نہ رہے۔ یہ طرز عمل اسلام سے دوری کا باعث ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نفسیاتی عوارض کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کی بجائے دوسرے سہاروں کو تلاش کرتا ہے۔ وہ اپنی روایات اور اقدار کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ وہ ایک ابنارمل شخصیت کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ بانو نے بڑی فنی چابک دستی کے ساتھ افسانے میں اللہ پر یقین نہ کرنے اور دنیاوی آسائش پرستی کا شکار ہونے والے لوگوں کو آخری وقت کا بے رحم حال دکھایا ہے۔ بانو کے افسانوں میں انسانی جذبات روحانی اور باطنی مسائل پر خصوصی توجہ ملتی ہے۔ ایک طرف وہ فطرت انسانی کی فریب کاریوں، ہوس اور منافقانہ رویوں کے راز سے پردہ اُٹھاتی ہیں تو دوسری طرف نفس کی کارفرمائیوں کے پیچھے چھپے محرکات، شخصی تصادم

---

[7] خواتین افسانہ نگار (1930ء سے 1990ء)، مرتبہ۔ کشور ناہید (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1996ء)، 8۔

[8] نامور افسانہ نگار اشفاق احمد کی بانو قدسیہ ءمشرقی پنجاب کے شہر فیروز پور میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام بدرالزماں تھا جو ضلع حصار کے ایک حکومتی ادارے میں ڈائریکٹر تھے۔ بانو نے 1950ء میں ایم اے کیا۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "کچھ اور نہیں"، "بازگشت"، " دوسرا دروازہ"، "آتش زیرپا"، "امر بیل"، "سامان وجود"، "ناقابلِ ذکر"، "دست بستہ" شامل ہیں۔

[9] بانو قدسیہ، دست بستہ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2009ء)، 233۔

اور روحانی کرب کو زیر بحث لاتی ہیں۔ ان کے کرداروں کا تعلق روحانی و باطنی کیفیات، فلسفیانہ و نظریاتی اساس کے ساتھ نہایت گہرا ہے: "کون ہے اللہ؟ کسی کو یاد کرتے مر جاتے ہیں غریب؟ ارے تیرے اللہ نے تو پیغمبروں کی نہ سنی وہ معمولی آدمی کی کب سنتا ہے..."[10] ان کے افسانوں میں اللہ کی ذات سے انکاری اور متکبر انسان اکثر دربدر کی ٹھوکریں کھاتا نظر آتا ہے اور ایسا ابنِ آدم جو ابلیس کے بہکاوے اللہ سے مایوس ناامید ہے۔ اس ضمن میں بانو قدسیہ فلسفیانہ مباحث پیش کرتی ہیں، جس کی مثال یہ اقتباس ہے:

> رب اور میرا پرانا بیر ہے۔ جنت سے چلا آتا ہے۔ وہاں ایک بار بابا آدم نے اللہ کے حکم کو چھوڑ کر مائی حوا کی مانی تھی تب کا غصہ ہی نہیں ختم ہوا تیرے رب کا۔[11]

روحانیت کی منزلیں طے کرنے کے لیے ضبط نفس تحمل اور برداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جذبات کے ہاتھوں انسان زندگی کی معنویت اور مقصدِ حیات سمجھنے سے عاری رہتا ہے۔ بانو کے ادب میں تصوف اور فلسفیانہ پہلو قاری ہر جگہ محسوس کرتا ہے۔ اللہ کے احکام کے مقابلے میں اس دنیا کے تمام علم ہیچ ہیں، افضلیت اللہ کے علم اور اس کے احکام کی ہے۔[12] ایک جگہ لکھا ہے: "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے سرمد! یہاں عمل کا ہاتھ چھوڑ کر عبادت نہیں کی جاسکتی اسلام سارے مذاہب سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں دین و دنیا میں توازن پیدا کرنا ہوتا ہے۔"[13] بانو قدسیہ کے افسانوں میں منفی سوچ سیاہ اور سفید کا فرق مذہبی رسومات پر عمل پیرا ہونے والوں پر بنیاد پرستی کا ٹیگ لگا دینے اور اور مسلمانوں کے بارے میں غیر اقوام کے جارحانہ رویے کی تردید و مذمت کا پہلو واضح دیکھا جاسکتا ہے۔ بانو ان تمام مسائل میں گھرے انسان کو اللہ سے دوری کا سبب ٹھہراتی ہیں۔ ان کے مطابق اگر حق اور سچ کے ساتھ زندگی کا ہر فیصلہ کیا جائے تو انسان زندگی کی سچائی کو جاننے میں کامیاب رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے افسانوی ادب میں بھی اللہ پر گہرے یقین رکھنے کا سبق دیتی ہیں۔

## جمیلہ ہاشمی

جمیلہ ہاشمی (1929ء۔1988ء)[14] کے افسانوں میں مذہبی رنگ تصوف کے انداز میں اور حقوق و فرائض کی ادائیگی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ رشتوں کا احترام صرف اسلام میں نہیں ہر مذہب کا تقاضا ہے، خاص کر ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے پورے نظام سے لازم و ملزوم ہے۔ "تم عورت کو اس لیے کیوں دیکھتے ہو کہ وہ مرد کے لیے زندہ ہے۔ اس کی اپنی الگ کوئی زندگی کیوں نہیں اس کا اپنا ایک الگ وجود ہے۔"[15] جمیلہ موت اور حیات کے بارے میں نظریات اور کائنات سے مضبوط

---

[10] بانو قدسیہ، "مراجعت"، مشمولہ۔ کچھ اور نہیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء)، 205۔

[11] بانو قدسیہ، "ڈاھڈے سنگ پریت"، مشولہ، دست بستہ، 142۔

[12] بانو قدسیہ، موسم سرما میں نیلی چڑیا کی موت، مشمولہ، سامان وجود (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2005ء) 117۔

[13] بانو قدسیہ، "ایک دو اور تیسرا وہ"، مشمولہ، دست بستہ، 40۔

[14] جمیلہ ہاشمی گوجرہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد برکت علی تاجر تھے اور والدہ گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ ان کے تین ناول شائع ہوئے اور افسانوں کے مجموعوں میں "اپنا اپنا جہنم"، "آپ بیتی جگ بیتی" اور "رنگ بھوم" شامل ہیں۔

[15] جمیلہ ہاشمی، تلاش بہاراں (سندھ: اُردو اکیڈمی، 1962ء)، 94۔

رشتوں کی عکاسی کرتی ہیں: "کیا پھول کا ٹوٹنا ہی اس کی زندگی کا راز تھا، نہیں اس کی خوشبو پھیل کر اب کائنات کی ان باقی خوشبوؤں میں مل گئی ہے، اس کی پتیوں میں بند گیت اب کھل کر ناچ کے ان چکروں میں مل گئے۔ اب پھول آزاد ہو گیا، ایک بیل سے چمٹ کر وہ زندگی کے وسیع گھن گرج میں مل گیا۔"[16]

جمیلہ زندگی اور موت کے درمیان انسان کو ایک ادنیٰ سی چیز ثابت کرتی ہیں اور کئی جگہ زندگی اور موت کے ازلی اور ابدی دائرے میں انسان کو جگہ جگہ بے بسی دکھاتی ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ فطری آفتیں تو انسان کو مجبوراً برداشت کرنی پڑتی ہیں، لیکن انسان کا زندگی اور موت پر قادر اس ذات پر یقین گہرا ہونا ہی ایمان کی دلیل ہے۔

**قراۃ العین حیدر**

قراۃ العین حیدر(1926ء-2007ء)[17] کے ہاں بھی اسلامی تصورات اور عقیدے ملتے ہیں جو اُن کے افسانوں میں نمایاں ہیں۔ عورت کی زندگی کے مسائل اور دنیاوی رشتوں سے لازوال محبت ان کے افسانوں کے اہم موضوعات ہیں۔ عورت کے عقیدے کے بارے میں دیکھیے:

> یہ عورتیں ہی ہیں جو رو رو کر خدا سے فریاد کرتی ہیں اور دعائیں مانگتی ہیں، ساری دنیا کے معبدوں کے سرد ، بے حس پتھر عورتوں کے آنسوؤں سے مسلتے رہتے ہیں، عورتیں اتنی پرستار، اتنی پجارنیں کیوں ہیں، اس لیے کہ وہ کمزور ہیں اور سہارے کی حاجت مند ہیں۔ اس لیے کہ وہ اس مختصر سی زندگی میں بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں۔[18]

ان کے کئی ایسے افسانے جیسے "کیکٹس لینڈ"، "شیشے کے گھر" میں پاکستانی مسلمانوں کے آئیڈیل عربوں کے اخلاقی زوال کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ تو کہیں مولوی صاحبان کے تصورات کو بھی آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے۔ اور پھر اس المیے میں ہجرت کا سفر شروع کیا، خون دریا اور موت کی دلدلیں، تاروں پر لٹکتی لاشیں نگاہیں۔[19]

قرۃ العین کے روبرو سیاسی و تہذیبی پردے اور ان میں چھپے مسائل ہیں جس میں وہ اپنے گردو پیش کے حقیقی مسائل کے ادراک کے ساتھ ہی اجتماعی دکھ میں شرکت کرتی ہیں۔ آرزو اور نفسا نفسی کے اس دور میں پرانی تہذیبوں کو بھی بیان کرتی ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے "روشنی کی رفتار" میں بنی اسرائیل کے انبیاء، سینٹ فلورا آف جارجیا، یورپ کی عیسائی تہذیب، وسط ایشیا کی اسلامی متصوفانہ روایتیں انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہیں، وہ اپنی پرانی روایات اور اقدار کو اپنانے پر زور تو دیتی ہیں؛ مذہب سے دوری کو مسلمانوں کی پستی کا سبب ٹھہراتی ہیں۔ وہ رسم و رواج اور تہذیبی فضا کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ ہمارے سماج میں عورت جہاں

---

[16] جمیلہ ہاشمی، تلاش بہاراں، 64۔

[17] قرۃ العین حیدر علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کا پہلا افسانہ "یہ باتیں" لاہور اخبار سے چھپا۔ ان کے مشہور زمانہ ناول "میرے بھی صنم خانے"، "آگ کا دریا"، "آخر شب کے ہمسفر" ہیں۔ افسانوی مجموعوں میں "ستاروں سے آگے"، "شیشے کے گھر"، "پت جھڑ کی آواز"، "روشنی کی رفتار"، "جگنوؤں کی دنیا" اور "یاد کی ایک دھنک جلے" ہیں۔

[18] قراۃ العین حیدر، یادوں کی اک دھنک جلے((لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2005)، 54۔

[19] قرۃ العین حیدر، کیکٹس لینڈ، شیشے کے گھر (لاہور: مکتبہ جدید، 1945ء)، 222۔

ظلم، کرب سے گزرتی ہے، ٹونے، تعویذ، گنڈوں، دعاؤں، منتوں، مرادوں کو بھی اختیار کرتی ہے، فکر اور فلسفے کی نئی راہیں تلاش کرتی ہیں۔ ان کے ایک ایک حرف میں گہرا عرفان چھپا ہوا ہے جو انسان کے لیے روحانی بالیدگی کے دروازے کھولتا ہے۔

**خدیجہ مستور**

خدیجہ مستور (1927ء-1982ء) [20] کے افسانوں میں بھی کئی جگہ ایسے حوالے ملتے ہیں جہاں مجبوری اور بے بسی میں پھنسے انسان کہیں اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور کہیں مجبور ہو کر دعائیں کرتے ہیں:

> ابھی سے مانگنے لگی صبر نہ آیا تجھے۔ تیرے کنبے نے بھی کبھی کسی سے کچھ نہ مانگا تھا؟ اللہ کرے کہ تو جھوکی مرے تیری لاش اُٹھے۔[21]

خدیجہ کے کئی افسانوں میں انسانیت کے ساتھ ہونے والے ظلم اور بے بسی کی کیفیت میں پھنسے انسان کا ذکر ہے کہیں تو وہ گہرے توکل کے ساتھ وارد ہوتی ہے اور کہیں بد دعائیں دیتا ہے۔ اس شخصی رویے کو خدیجہ نے بڑی چابک دستی کے ساتھ بیان کیا ہے:

> شہر کی گہما گہمی کو موت نے نگل لیا، زندگی کونوں کھدروں میں منہ چھپائے سسک رہی تھی، روتی سسکتی زندگی کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر چن چن کر پناہ گزینوں تک پہنچا رہے تھے، اس روز بھی وہ سارا دان لاری پر ویران شہر کے گوشے گوشے کے چکر لگا کر پچاس فساد زدہ انسانوں کو کیمپ پہنچا کر محفوظ کر چکا تھا۔[22]

**ہاجرہ مسرور**

ہاجرہ مسرور (1929ء-2012ء)[23] سماجی کوتاہیوں کو تفصیلاً بیان کرتی ہیں کہ معاشرہ سماج عورت کی معمولی غلطی کو بھی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ خیر اور شر کے معیار میں ہم کہاں کھڑے ہیں۔ دل اور روح کو مجروح کرنے سے پہلے خوف خدا شاید کہیں اور چلا جاتا ہے۔ ہاجرہ مسرور کے افسانوں میں ہمیں خیر و شر کا تصور بھی واضح نظر آتا ہے:

> معمولی خراش طعن کے زہریلے ناخنوں سے کریدی جارہی تھی یہاں تک کہ وہ خراش ایک بڑا سا گھاؤ بنا دی گئی، ایسا گھاؤ جو اندر ہی اندر سڑ کر زہر ہو جائے اور پھر اس کا زہر زندگی میں سکرات طاری کر دے لیکن خوف ناک ناخن پھر بھی چین نہیں لینے دیتے۔[24]

---

[20] خدیجہ مستور کے والد ڈاکٹر تھے، گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا۔ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے ان کا تبادلہ مختلف شہروں میں ہوتا رہا۔ ان کا پہلا افسانہ "جوانی" رسالہ ساقی میں شائع ہوا۔ خدیجہ مستور کے پانچ افسانوی مجموعے اور دو ناول شائع ہوئے۔ ان کے افسانوی مجموعے "کھیل"، "بوچھاڑ"، "چند روز اور"، "تھکے ہارے" اور "ٹھنڈا میٹھا پانی ہے" شامل ہیں۔

[21] خدیجہ مستور، ٹھنڈا میٹھا پانی، (لاہور: مطبوعات، 1981ء)، 72۔

[22] خدیجہ مستور، چند روز اور، (لاہور: مکتبہ اُردو، س ن)، 57۔

[23] ہاجرہ مسرور خدیجہ مستور کی بہن تھیں۔ انھیں 2005ء میں عالمی اُردو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "ہائے اللہ"، "اندھیرے اجالے"، "سب افسانے میرے"، "تیسری منزل"، "چوری چھپے"، "چرکے" شامل ہیں۔

[24] ہاجرہ مسرور، "بندر کا گھاؤ"، مشمولہ، سب افسانے میرے (لاہور: نیا ادارہ، 1991ء)، 40۔

ہاجرہ ہندو مسلم منافرت، قوم پرستی اور منفی سوچ سرمایہ دارانہ نظام کو بھی کئی جگہ موضوع بناتی ہیں۔ بستی بھر کے سامنے ہندو منافرت کا ثبوت گوری چمڑی والوں کو دے دیا گیا لالہ سادھو کا موقعہ پورا ہو گیا جیسے ابنِ آدم کا ہیولا اچانک بلی کے پنجوں کی طرح خراشیں ڈال دیتا ہے۔[25] قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونے والے مسائل اور لالچ کے ضمن میں ان کے افسانے "راجہ ہل"، "اندھیرے اجالے"، "ہائے اللہ" وہ افسانے ہیں، جس میں سرمایہ دارانہ نظام نے عام انسان کی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں لالچ میں اللہ کا خوف بھلا دینے والوں کے انجام اور اصلاح دونوں ہی ملتے ہیں۔

**جیلانی بانو**

جیلانی بانو(1936ء)[26] کے ہاں حیدر آباد دکن کی تہذیبی روایات اور لب و لہجہ نظر آتا ہے، کائنات بدلتے حالات، اقدار، عورت اُس کی فطرت، اُس کے مسائل، اُن کا خاص موضوع ہیں۔ وہ نمایاں کرتی ہیں کہ اسلامی معاشرے اور سماج میں ایک طبقہ کس طرح دوسرے طبقے کی حق تلفی کرتا ہے، بھوک و افلاس سے کیسے متعدد کئی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ کس طرح غریب طبقہ محنت کے باوجود اپنا حق حاصل نہیں کر پاتا، اخلاقی برائیاں، جن میں حرص، ہوس، نفرت، حسد، کینہ شامل ہیں، کس طرح ہماری جڑوں کو کمزور کر رہی ہیں، کس طرح معاشرے میں چھوٹی چھوٹی تلخیاں بڑی بڑی خوشیوں کو کھا جاتی ہیں۔ متضاد اور منافقانہ رویے طرز عمل کس طرح سوسائٹی کا حصہ بن چکے ہیں، شرافت ختم ہوتی جا رہی ہے اور مذہب سے دوری کس طرح ہمیں کھوکھلا کر رہی ہے۔ ہم اپنے پیاروں کی موت پر رونے کی بجائے اس وسیلے پر روتے ہیں جو ہم سے چھن جاتا ہے، خواہ سامنے گائے کی لاش ہو یا ماں کی۔[27]

جیلانی بانو کے افسانوں میں والدین کی جانب سے بیٹوں کو بیٹیوں پر فوقیت دینے، جہیز جیسی لعنت اور عائلی زندگی کے مسائل کا بھی ذکر ملتا ہے: "ابا سمجھتے ہیں لڑکوں کو پڑھانا تو روپے کو بیاج پر چلانا ہے، بعد میں مع سود وصول کر لو۔"[28]

جیلانی بانو متوسط طبقے کے مسائل اجتماعی زندگی کے دکھ سکھ اور منقسم خاندانوں، جاگیر دارانہ نظام کی فرسودیت بھارت میں بابری مسجد کے انہدام کی کوشش، گجرات کے مسلمانوں کا قتل عام اور مجموعی طور پر وہاں کے مسلمانوں کے احساسِ عدم تحفظ جیسے موضوعات کو بیان کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

> میں دراصل وہ کمزور انسان ہوں جو حضرت امام حسینؑ کے زمانے میں پیدا ہوا تھا مگر ان کے ساتھ جانے والے جانثاروں میں شامل ہونے کی ہمت نہ کر سکا۔[29]

جیلانی بانو کے ہاں سماج کے منفی رویوں اور مظالم کی داستانیں بڑی جامع انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

---

[25] ہاجرہ مسرور، چوری چھپے (لاہور: مقبول اکیڈمی، 1991ء)، 187۔

[26] جیلانی بانو کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی۔ مختلف ادبی و سماجی تنظیموں کی سرگرم رکن ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعوں میں "روشنی کے مینار"، "نروان"، "پرایا گھر"، "روز قصہ"، "یہ کون ہنسا"، "نئی عورت"، "سوکھی ریت"، "کن" اور "راستہ بند ہے" شامل ہیں۔

[27] جیلانی بانو، نروان، مشمولہ، ایوان غزل، ناویشان، (نئی دہلی: 1973ء)، 22۔

[28] جیلانی بانو، ستی ساوتری، نروان (دہلی: مکتبہ جامعہ، 1963ء)، 79۔

[29] جیلانی بانو، سوکھی ریت (کراچی: مکتبہ دانیال، 2003ء)، 11۔

## سائرہ ہاشمی

سائرہ ہاشمی (1938ء)[30] عورت اور سماج کو خصوصیت سے موضوع بناتی ہیں۔ معاشرے میں عورت کا مقام بڑے تقدس کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ میں صرف ایک عورت ہوں بغیر کسی مقدس رشتے کے۔ [31] عورت کو آج تک اسلام کا دیا مقام نہ مل سکا۔ عورت ساری زندگی گھر رشتے بناتی ہیں، سمجھوتے کرتی ہے، لیکن پھر بھی خود اُس کا وجود کھو جاتا ہے، اور کوئی اُس کی ذات کے ختم ہونے کو محسوس نہیں کرتا، حالانکہ ہمارے مذہب میں تو یہ روایت نہیں ہے:

اس نے میری محبت چکائی تھی، میں بک گئی تھی، اس تمام سودے میں دل کا تو کہیں ذکر نہ تھا۔[32]

سائرہ ہاشمی کے افسانوں میں عورت کو مال کی مالک ہونے کے باوجود معاشرے اور فرد کی ٹھوکروں میں دکھایا گیا ہے۔ مرد وزن کی اس دنیا میں بلاشبہ عورت کمزور ہے۔ خاص کر ہمارے معاشرے میں عورت کو مرد کے مقابلے میں وہ حیثیت نہیں دی جاتی جو اسلام نے عورت کو دی ہے۔ سائرہ ہاشمی کے افسانے "لمحے کی صلیب"، "سائے کی گونج" ، "خدا بہت دور ہے" میں بھی برے کاموں کے برے انجام اور مکافاتِ عمل جیسے کئی موضوعات شامل ہیں۔

## خالدہ حسین

خالدہ حسین (1937ء-2019ء)[33] معاشرے کی تلخ مگر سچی محرومیوں اور حقیقتوں کی من وعن عکاس ہیں۔ وہ معاشرے کے کئی ایسے پنہاں پہلو اور صورتیں افسانوی ادب میں نمایاں کرتی ہیں، جس میں فرد کو اپنی اصل سے قریب کرنے کا سبق کارفرما ہوتا ہے۔ اُردو افسانے میں اسلام سے دوری اور مغربی روایات کو اپنانے کا انجام اور اس کے نتائج خالدہ حسین نے اپنے موضوعات میں احسن طریقے سے عیاں کیے ہیں۔ خالدہ حسین کا نام ان افسانہ نگاروں کی فہرست میں آتا ہے، جن کے ہاں وجودی نقطۂ نظر اور کشف ذات کی تلاش اور آرزو کا تصور ملتا ہے۔ اپنے افسانوی مجموعے "پہچان" کے آغاز میں لکھتی ہیں:

ہر احساس و فکر کا سوتا خود انسان کی اپنی ذات سے اور زیادہ صحیح الفاظ میں تحت الذات سے پھوٹتا ہے۔[34]

تجریدی، علامتی افسانہ نگار خالدہ حسین باطنی زندگی کا سفر طے کرتی ہیں۔ ان کی صوفیانہ اصطلاح "تحت الذات" خاص اہمیت کی حامل ہے۔ وہ ایسا معاشرہ دکھاتی ہیں جو اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں بلکہ متضاد رویوں کا حامل ہے۔ مرد کے لیے اُس کا رویہ اور ہے اور عورت کے لیے اور۔ ازدواجی زندگی عورت سے عورت پن چھین لیتی ہے۔ عورت کی ذہانت اور قابلیت کو تسلیم نہیں

---

[30] سائرہ ہاشمی کے اہم افسانوی مجموعوں میں "ریت کی دیوار"، "سنگ زیست"، "تماشا ہو چکا"، "وہ کالی ہو گی" اور "زندگی بند گلی" قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عصرِ حاضر کی نمائندگی بڑے ہی جامع انداز میں کی۔

[31] سائرہ ہاشمی، گنبد کی آواز (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز 2001ء)، 243۔

[32] سائرہ ہاشمی، ریت کی دیوار (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1999ء)، 22۔

[33] خالدہ حسین کے والد انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا۔ 1945ء میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "ہچان"، "دروازہ"، "مصروف عورت"، "میں خواب ہنوز" اور "میں یہاں ہوں" خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

[34] خالدہ حسین، پہچان، (کراچی: خالد پبلی کیشن، 1981ء)، 4۔

کیا جاتا اور بیوی کے روپ میں تو نا قابل قبول ہے۔ معاشرے سے سوال کرتی ہیں کہ بحیثیت مرد عورت کے حقوق کہاں ہیں؟ آدھی عورت میں افسانے کا آغاز ہی یوں ہوتا ہے:

> ایک صبح وہ جاگی تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کی داہنی آنکھ باہنی آنکھ سے الگ دیکھتی ہے اور دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے الگ، ان کا باہمی رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور ان چاروں نے باہم کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ تب وہ اپنے آدھے پن سے بہت پریشان ہوئی، خوف کا ایک گھنا سیاہ مرغولہ اس کے چاروں سمت پھیل گیا اور سہم کر اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپانا چاہا مگر ان دونوں سے اس کا چہرہ نہ چھپ سکا۔[35]

خالدہ حسین دو الگ الگ نظام ہائے تعلیم کی مذمت کرتی ہیں۔ وہ اس بے انصافی کو معاشرے کے لیے گھن قرار دیتی ہیں، جو اندر ہی اندر سے معاشرے کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ ان کے افسانے "قفل ابجد"، "ابنِ آدم"، "دہائی"، "جزیرہ" جیسے عنوانات میں خیر و شر کا تصور، احساسِ تنہائی، ملال کے عالم میں سمٹنے اور سمیٹنے کی سعی میں افضل ہونے کی امنگ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی میں نیکی اور بدی کی قوتیں متواتر چلتی ہیں۔ انسان وقت کی قید میں ہے، صنعتی ترقی ہونے کے باوجود ذہنی سکون سے قاصر ہے۔ لکھتی ہیں: "لوگوں کو ہم نے تخلیق کیا ہے۔ ہم دوسروں کی سوچ میں زندہ ہیں اور جب دوسرے ہمیں سوچنا چھوڑ دیں گے تو ہم مر جائیں گے۔"[36]

## حاصل بحث

بیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں اسلامی اور متصوفانہ رجحان داخلی و خارجی دونوں حوالوں سے واضح نظر آتا ہے۔ خدمتِ خلق، احترامِ آدمیت، اخلاقی اقدار اور عورت کا احترام جیسے موضوعات ان خواتین کے افسانوں میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ فلسفیانہ نظریاتی اساس پر مبنی افسانوں میں صرف روحانی و باطنی مشاہدات ہی نہیں، بلکہ ان سے وابستہ کیفیات کو بھی فنی مہارت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں مطالعے کے لیے منتخب افسانہ نگاروں اختر جمال، جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ، خالدہ حسین، جمیلہ ہاشمی اور سائرہ ہاشمی نے آشوب ذات اور باطن کی سرگزشت کو کرداروں کی ذہنی کش مکش کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں روحانی و اخلاقی رجحانات اور زندگی اور کائنات کے بارے میں مثبت و منفی سوچ کے گہرے تجربے ملتے ہیں۔ صوفیانہ گفت گو داخلی و باطنی کرب و کیفیات، آگے بڑھنے کی منزل اور سائنسی و مادی ترقی سے ذہنی و روحانی سکون کس طرح ختم ہو گیا ہے، یہ تمام تجربات ان کے افسانوں کا حصہ ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے افسانوی موضوعات میں ذاتِ باری تعالیٰ پر پختہ یقین بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس بحث سے واضح ہوتا ہے کہ خواتین افسانہ نگاروں نے اسلامی نظریے کے حوالے سے افسانوی ادب میں کئی موضوعات پر جامع انداز میں لکھ کر اس صنف کو ترقی دی ہے۔ یہ روایت اپنا رنگ اور مضبوط کرتی ہوئی بیسویں سے اکیسویں صدی میں داخل ہو گئی ہے۔

---

[35] خالدہ حسین، آدھی عورت، دروازہ (جنوری، 1984ء)، 84۔

[36] خالدہ حسین، دروازہ (کراچی: خالد پبلی کیشن، 1984ء)، 247۔